باب 19

خاکہ، انشائیہ، مکتوب، سوانح اور سفرنامے کی روایت

خاکہ نگاری:

خاکے کو مرقع یا قلمی تصویر بھی کہتے ہیں۔ خاکے میں کسی شخصیت کے ظاہری اور باطنی اوصاف بیان کیے جاتے ہیں۔ اس میں شخصیت کی خوبیوں یا خامیوں کا بیان اس طرح کیا جاتا ہے کہ پڑھنے والے کے سامنے اس شخصیت کی ایک قلمی تصویر اُبھر آئے۔

اردو میں خاکہ نگاری کے ابتدائی نقوش تذکروں میں ملتے ہیں۔ محمد حسین آزاد کی 'آبِ حیات' میں خاکہ نگاری کے بعض عمدہ نمونے موجود ہیں۔ اردو میں خاکہ نگاری کی روایت کو بیسویں صدی میں زیادہ فروغ ملا۔ مرزا فرحت اللہ بیگ، مولوی عبدالحق، خواجہ حسن نظامی، رشید احمد صدیقی، اشرف صبوحی اور شاہد احمد دہلوی وغیرہ نے اس فن کی روایت کو پروان چڑھایا۔

مرزا فرحت اللہ بیگ نے اپنے استاد ڈپٹی نذیر احمد کا خاکہ لکھا، جس کا عنوان ہے 'مولوی نذیر احمد کی کہانی کچھ ان کی کچھ میری زبانی'۔ یہ اردو کا اوّلین خاکہ ہے۔ فرحت اللہ بیگ نے یہ خاکہ اس انداز سے لکھا ہے کہ نذیر احمد کی شخصیت پوری طرح نمایاں ہوگئی ہے۔ فرحت اللہ بیگ نے دہلی کی ٹکسالی زبان کو بڑی مہارت سے استعمال کیا ہے۔ انھوں نے 'ایک وصیت کی تعمیل میں' کے عنوان سے وحیدالدین سلیم کا بھی عمدہ خاکہ کھینچا ہے۔

اسی عہد میں مولوی عبدالحق نے خاکہ نگاری کے فن کی طرف توجہ کی۔ خاکوں پر مشتمل ان کی تصنیف 'چند ہم عصر' میں چودہ خاکے ہیں، ان میں جن شخصیات کا خاکہ کھینچا گیا ہے ان میں نامور شخصیات شامل ہیں اور عام آدمی بھی۔ مولوی عبدالحق کے خاکوں میں شخصیت کی ظاہری تصویر تو ابھرتی ہی ہے، ساتھ ہی اس کے جذبات واحساسات اور عادات واطوار بھی نمایاں ہو جاتے ہیں۔ 'نام دیو مالی' اور 'گدڑی کا لال' ان کے عمدہ خاکے ہیں۔

خواجہ حسن نظامی نے 'غالب کا حلیہ' کے عنوان سے غالب کا خاکہ لکھا ہے۔ اس خاکے میں حسن نظامی نے غالب کے خطوط کی نثر کو اس طور پر استعمال کیا ہے کہ یہ ان کے اپنے جملوں کا حصہ بن گئی ہے۔ اس طرح اس خاکے میں مزاح کا لطیف عنصر پیدا ہو گیا ہے۔

رشید احمد صدیقی نے خاکہ نگاری کے فن کی طرف خصوصی توجہ کی۔ 'ہم نفسانِ رفتہ' اور 'گنج ہائے گرانمایہ' ان کے خاکوں کے مجموعے ہیں۔ رشید احمد صدیقی کے خاکوں کا نمایاں وصف یہ ہے کہ ان میں قلمی تصویریں چلتی پھرتی نظر آتی ہیں۔ وہ مزاح کے پیرایے میں کردار کے اوصاف کے ایسے نقوش ابھارتے ہیں کہ شخصیت کے خدوخال نمایاں ہوجاتے ہیں۔ بات سے بات پیدا کرنا انھیں خوب آتا ہے۔ انھوں نے مولوی، لیڈر، وکیل اور دیگر پیشوں سے وابستہ شخصیات کو موضوع بنا کر ان کے خاکے لکھے ہیں۔ اپنے عہد کی نامور شخصیات مولانا سیّد سلیمان ندوی، مولوی عبدالحق، مولانا ابوالکلام آزاد، پطرس بخاری، جگر مرادآبادی، مولانا محمد علی جوہر، علّامہ اقبال اور ڈاکٹر مختار احمد انصاری وغیرہ کے عمدہ خاکے کھینچے ہیں۔

بیگم انیس قدوائی اردو کی پہلی خاتون خاکہ نگار ہیں۔ انھوں نے عقیدت مندی کے ساتھ بزرگوں اور سلف صالحین کی سیرت کو اپنے خاکوں کا موضوع بنایا ہے۔ 'اب جن کے دیکھنے کو......' اور 'نظرے خوش گزرے' ان کے خاکوں کا مجموعہ ہے۔

اشرف صبوحی نے دلّی کی ان گمنام شخصیتوں کے خاکے لکھے جو یادگارِ زمانہ ہیں۔ 'دہلی کی چند عجیب ہستیاں' ان کے خاکوں کا مجموعہ ہے۔ دلّی کی مخصوص چٹخارے دار زبان اور اشرف صبوحی کے مخصوص اندازِ بیان کی وجہ سے یہ خاکے جیتی جاگتی تصویریں معلوم ہوتے ہیں۔

شاہد احمد دہلوی نے اپنے بزرگوں، دوستوں اور ساتھیوں کے خاکے لکھے۔ 'گنجینۂ گوہر'، 'بزمِ خوش نفساں' اور 'طاقِ نسیاں' ان کے خاکوں کے مجموعے ہیں۔ دہلی کی ٹکسالی زبان پر انھیں مہارت حاصل تھی۔ ان کی تحریروں میں دلّی کے روزمرّہ اور چٹخارے دار زبان کے عمدہ نمونے ملتے ہیں۔ ان کے تحریر کردہ خاکوں میں خواجہ حسن نظامی، میر ناصر علی اور بیخود دہلوی کے خاکے اہم ہیں۔

سعادت حسن منٹو کے خاکوں کے مجموعے 'گنجے فرشتے' اور 'لاؤڈ اسپیکر' شائع ہوئے۔ عصمت چغتائی نے 'دوزخی' کے عنوان سے اپنے بڑے بھائی عظیم بیگ چغتائی کا خاکہ لکھا۔ 'یادِ رفتگاں' صباح الدین عبدالرحمٰن کے خاکوں کا مجموعہ ہے۔ 'سایے اور ہمسایے' اور 'ذکرِ خیر' یوسف ناظم کے خاکوں کے مجموعے ہیں۔ ان کے خاکوں میں مزاح کا عنصر پایا جاتا ہے۔ اکابرین اور بزرگانِ دین کی سیرت نگاری میں بھی ان کے یہاں مزاح کا عنصر غالب رہتا ہے۔ یوسف ناظم نے پھلوں اور ترکاریوں کے بھی خاکے کھینچے ہیں۔ 'آدمی نامہ'، 'آپ کی تعریف'،

'چہرہ در چہرہ' مجتبیٰ حسین کے خاکوں کے مجموعے ہیں۔ 'چہرے' ندا فاضلی کے، 'تصویریں اجالوں کی' نورالحسن نقوی کے اور 'اکثر یاد آتے ہیں' مظہر امام کے تحریر کردہ خاکوں کے مجموعے ہیں۔

انشائیہ نگاری :

انشائیہ کو انگریزی میں LIGHT ESSAY کہا جاتا ہے۔ اس میں مصنف اپنے مشاہدات و تجربات کو بے تکلفی سے بیان کرتا ہے اور ایسا انداز اختیار کرتا ہے کہ بات سے بات پیدا ہوتی چلی جاتی ہے۔ انشائیے میں انشائیہ نگار کہیں کہیں لطیف مزاح کا عنصر بھی شامل کرتا ہے لیکن اس بات کا خیال رکھتا ہے کہ مزاح کا انداز حد سے بڑھنے نہ پائے۔

اردو میں انشائیہ نگاری کا آغاز سرسیّد سے ہوتا ہے۔ انھوں نے علمی و اصلاحی مقاصد کے تحت جو مضامین لکھے، ان میں سے کچھ مضامین انشائیے کی تعریف پر پورے اترتے ہیں اسی لیے سرسیّد کے مضامین 'امید کی خوشی' اور 'بحث و تکرار' وغیرہ کو انشائیہ کی ابتدائی مثال مانا جاتا ہے اسی زمانے میں محمد حسین آزاد نے انشائیے لکھ کر (جن میں بیش تر ترجمہ تھے) اردو میں انشائیہ نگاری کے فن کو تقویت عطا کی۔ 'گلشنِ امید کی بہار'، 'سچ اور جھوٹ کا رزم نامہ' اور 'انسان کسی حال میں خوش نہیں رہتا' ان کے نمائندہ انشائیے ہیں۔ 'نیرنگِ خیال' ان کے انشائیوں کا مجموعہ ہے۔

عبدالحلیم شرر، سجّاد انصاری، مہدی افادی اور میر ناصر علی دہلوی نے اردو میں انشائیہ نگاری کی روایت کو مزید مستحکم کیا۔ 'پھول برسات'، 'کھلتا ہوا پتّا'، 'بزمِ قدرت' عبدالحلیم شرر کے، محاسن و معاصی' سجاد انصاری کا، 'خوابِ طفلی' اور 'آرزوئے شباب'، مہدی افادی کے 'مسکرانا'، 'ہم اور ہماری ہستی' اور 'زندگی کی شام' میر ناصر علی دہلوی کے معروف انشائیے ہیں۔

بیسویں صدی میں عبدالماجد دریابادی، خواجہ حسن نظامی، مرزا فرحت اللہ بیگ، رشید احمد صدیقی، پطرس بخاری اور کنھیا لال کپور کے انشائیوں سے اس فن کو بڑا فروغ ملا۔ عبدالماجد دریابادی کے انشائیے 'جھوٹ میں سچ' اور 'الفاظ کا جادو'، خواجہ حسن نظامی کے 'دیا سلائی'، 'مٹی کا تیل'، 'جھینگر کا جنازہ'، 'الّو اور مرغ کی اذان'، مرزا فرحت اللہ بیگ کے 'ایک اور ایک چار'، 'بیوی کی انا'، 'خفسانہ' اور 'اونھ'، رشید احمد صدیقی کے 'چارپائی'، 'ارہر کا کھیت'، 'دعوت' اور 'پاسبان'، پطرس بخاری کے 'کتّے' اور 'سویرے جو کل میری آنکھ کھلی'، عبدالعزیز فلک پیما کے 'گنوار کی دعا'، 'کچھ

جھوٹ کچھ سچ' اور' نئی دکان' اور کنھیالال کپور کے' اخبار بینی'، ' اپنے وطن میں سب کچھ ہے پیارے' اور' برج بانو' وغیرہ مقبول ومعروف انشائیے ہیں۔

عصر حاضر کے اہم انشائیہ نگاروں میں یوسف ناظم، شفیق الرحمٰن، وزیر آغا، مشتاق احمد یوسفی، نظیر صدیقی، مجتبیٰ حسین، احمد جمال پاشا اور نریندر لوتھر کے نام شامل ہیں۔

مکتوب نگاری:

خط دو افراد کے درمیان رابطے کا تحریری وسیلہ ہے۔ خط میں انسان اپنے حالات اور خیالات نہایت سادگی اور بے تکلفی کے ساتھ بیان کر دیتا ہے۔ وہ اپنے دوستوں اور عزیزوں کو اپنا راز دار سمجھتا ہے اس لیے ان کے سامنے اپنے حالات بیان کرنے میں اسے کوئی تکلف نہیں ہوتا اسی لیے خطوط میں خط لکھنے والے کی سچی تصویر دکھائی دیتی ہے۔ اردو میں خطوط نگاری کی ادبی حیثیت مسلّم ہے۔ اسے مرزا غالبؔ نے ادبی مقام عطا کیا۔ غالبؔ سے پہلے بھی اردو میں خطوط لکھنے کا رواج تھا مگر ان خطوط کی کوئی ادبی حیثیت نہیں تھی۔

غالب کے اردو خطوط کے دو مجموعے' عودِ ہندی' اور' اردوئے معلیٰ' ہیں۔ غالبؔ نے شروع میں فارسی میں خط لکھے تھے پھر اسے ترک کر کے اردو میں خط لکھنے لگے۔ خطوط لکھتے وقت وہ روایتی تکلف اور القاب و آداب کے قائل نہیں تھے۔ بس قلم اٹھایا اور مکتوب الیہ کے مرتبے کے مطابق مخاطب کیا۔ ان کے خطوط میں شستہ اور دل کش عبارت آرائی کے بجائے مکالمے کا انداز پایا جاتا ہے۔ غالبؔ نے اپنے خطوط میں جہاں ذاتی کوائف، دلی کے حالات، دوستوں کے احوال بیان کیے ہیں وہیں بعض خطوط میں ادبی مسائل پر بھی اظہار خیال کیا ہے۔ دوستوں کے ساتھ ہنسی مذاق، سنجیدہ مسائل پر گفتگو، مخالفین کو ترکی بہ ترکی جواب، شادی بیاہ کی باتیں، بیماری وصحت کی اطلاع اور اپنے گرد و پیش کے حالات، ان تمام چیزوں کا بیان وہ اپنے خطوط میں شگفتہ انداز میں کرتے ہیں۔ واقعہ نگاری کا وصف ان کے خطوط کی خاص پہچان ہے۔ واقعے کی تصویر کشی وہ اس انداز سے کرتے ہیں کہ سارا منظر نظر کے سامنے آجاتا ہے۔ انھوں نے اپنے بعض اشعار کی تشریح بھی ان خطوط میں کی ہے اور علمی نکات بھی بیان کیے ہیں۔ غالب نے خطوط نگاری میں ایسا رنگ اختیار کیا جو سب سے نرالا تھا۔ ان کے خطوط کا کلّیات ڈاکٹر خلیق انجم نے مرتّب کر کے' غالب کے خطوط' کے نام سے پانچ جلدوں میں شائع کیا ہے۔

غالبؔ کے علاوہ سرسید نے بھی اپنے مکاتیب میں اپنے زمانے کی مسجّع اور مقفّٰی نثر کی بجائے عام بول چال کی رواں اور آسان زبان کا استعمال کیا۔

محمد حسین آزاد کے خطوط بھی خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ 'مکتوباتِ آزاد' ان کے خطوط کا مجموعہ ہے جو 1907 میں شائع ہوا۔ ان خطوط کے القاب و آداب میں سادگی پائی جاتی ہے۔ پنجاب سے اپنی محبت کا ذکر وہ بڑے والہانہ انداز میں کرتے ہیں۔

ڈپٹی نذیر احمد کے خطوط کا مجموعہ 'موعظۂ حسنہ' کے نام سے شائع ہوا۔ انھوں نے یہ خطوط اپنے فرزند مولوی بشیر الدین کو ان کی تعلیم کے زمانے میں لکھے تھے۔ ان خطوط میں انھوں نے عربی قواعد کے ادق مسائل بھی سمجھائے ہیں اور تعلیم کے میدان میں آگے بڑھنے کی طرف مائل کیا ہے۔ عربی اردو کے ساتھ انگریزی سیکھنے کی ترغیب بھی ان خطوط میں دی گئی ہے۔

مولانا الطاف حسین حالیؔ کے خطوط بھی ادبی اہمیت کے حامل ہیں۔ ان کے مکاتیب میں عالمانہ رنگ غالب نظر آتا ہے۔ عبارت کی آرائش کے وہ قائل نہیں مگر زورِ بیان اور فصاحت کا لحاظ رکھتے تھے۔ 1925 میں ان کے خطوط دو جلدوں میں 'مکتوبات حالیؔ' کے عنوان سے شائع ہوئے۔

شبلی نعمانی کی ادبی خدمات کا دائرہ بے حد وسیع ہے۔ اس میں ان کی مستقل نثری تصانیف کے علاوہ خطوط کی بھی خاص اہمیت ہے۔ شبلی کے خطوط کے مجموعے 'مکاتیبِ شبلی' اور 'خطوطِ شبلی' کے نام سے شائع ہوئے۔ آخر الذکر مجموعہ عطیہ فیضی اور زہرا فیضی کے نام خطوط پر مشتمل ہے۔ ان میں شعریت اور ادبیت کا عنصر غالب ہے۔ شبلی کے خطوط میں منظر کشی کے عمدہ نمونے ملتے ہیں۔ ان میں علمی اور لسانی مسائل، الفاظ کے املا اور تلفظ کی بحثیں ہیں۔ عام طور پر ان کی زبان سادہ اور رواں ہے۔

علامہ اقبال نے بھی اپنے معاصرین کو سیکڑوں خطوط لکھے ہیں۔ اقبالؔ کی مراسلت ملک و بیرون ملک کے نامور اساتذہ، فلاسفہ، سیاست داں، ادبا و شعرا، مصلحین اور نوابوں، جاگیرداروں سے تھی اور وہ ہر ایک کو اس کے مرتبے کا لحاظ رکھ کر خط لکھتے تھے۔

اقبال کا انداز تحریر شگفتہ اور رواں ہے۔ انھوں نے اپنے خطوط میں انگریزی الفاظ کا بے تکلف استعمال کیا ہے۔ ان خطوط میں انھوں نے اپنی شاعری کے متعلق بھی اظہارِ خیال کیا ہے اور بعض فارسی اشعار کی وضاحت بھی کی ہے۔ سید مظفر حسین برنی نے ان خطوط کو چار ضخیم جلدوں میں 'کلیات مکاتیب اقبال' کے نام سے شائع کیا ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد اردو خطوط نگاری کی تاریخ میں ایک اہم مقام رکھتے ہیں۔ انھوں نے احمد نگر کی جیل میں قید کے دوران اپنے دوست مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی کو خطوط لکھے تھے جو 'غبارِ خاطر' کے نام سے کتابی شکل میں شائع ہوئے۔ ان خطوط میں ماضی کی داستانوں اور حالیہ واقعات کے ساتھ ساتھ علمی مباحث اور ادبی تذکرے بھی ہیں۔ ان خطوط کا ایک خاص وصف آزاد کا وہ اسلوب ہے جس کی بنا پر یہ خطوط دلکش عبارت آرائی کی عمدہ مثال بن گئے ہیں۔ 'کاروانِ خیال' اور 'مکاتیبِ آزاد' ان کے خطوط کے دیگر مجموعے ہیں۔

ان خطوط نگاروں کے علاوہ امیر مینائی، اکبرالٰہ آبادی، مہدی افادی، عبدالماجد دریابادی، سید حسین بلگرامی، محمد علی ردولوی، حبیب الرحمٰن خاں شروانی، صفیہ اختر اور عصرِ حاضر کے کئی ادیبوں کے مکاتیب کے مجموعے منظرِ عام پر آچکے ہیں۔

سوانح نگاری:

سوانح عمری ادب کی ایک ایسی صنف ہے جس میں کسی فرد کی زندگی کے حالات و واقعات یعنی پیدائش سے لے کر موت تک کے تمام احوال و کوائف کو اس انداز سے پیش کیا جاتا ہے کہ اس کی زندگی کے تمام گوشے نمایاں ہو جاتے ہیں۔ غرض کہ سوانح عمری میں کسی انسان کی پیدائش، اس کا خاندانی پس منظر، عادات و اطوار اور ذہنی تاثرات و تجربات کی مکمل تصویر پیش کی جاتی ہے۔ اس کا موضوع کوئی دوسرا فرد بھی ہو سکتا ہے یا پھر خود مصنف۔ جب ایک مصنف کسی دوسرے شخص کی زندگی کے حالات و واقعات کو بیان کرتا ہے تو اسے سوانح عمری کہا جاتا ہے۔ جب مصنف خود اپنی زندگی کے حالات و واقعات اور تجربات و مشاہدات کو موضوع بناتا ہے تو اُسے خود نوشت سوانح سے موسوم کیا جاتا ہے۔

اردو میں سوانح نگاری کا آغاز مولانا الطاف حسین حالؔی کی لکھی ہوئی سوانحی کتب سے ہوا۔ انھوں نے فارسی کے مشہور ادیب سعدی شیرازی کی سوانح 'حیاتِ سعدی'، مرزا اسداللہ غالب کی سوانح 'یادگارِ غالب' اور سر سید احمد خاں کی سوانح 'حیاتِ جاوید' لکھیں۔

شبلی نعمانی نے قدیم مشاہیر کی سوانح عمری پر زیادہ توجہ کی۔ انھوں نے اردو میں سوانح نگاری کی روایت کو استحکام اور ایک خاص معیار عطا کرنے میں نمایاں کردار ادا کیا۔ 'المامون'، 'سیرۃ النعمان'، 'الفاروق'، 'الغزالی' اور 'سوانحِ مولانا روم' ان کی لکھی ہوئی اہم سوانح عمریاں ہیں۔ شبلی نے 'سیرت النبیؐ' کی تصنیف کا کام شروع کیا تھا۔ جسے ان کے شاگرد سید سلیمان ندوی نے ان کی وفات کے بعد مکمل کیا۔

بیسویں صدی میں سوانح نگاری کے فن کو کافی فروغ حاصل ہوا اور کئی سوانح عمریاں اور خود نوشتیں لکھی گئیں جن میں عبدالسلام ندوی کی 'اقبال کامل' سید سلیمان ندوی کی 'سیرۃ عائشہ'، 'حیات شبلی'، غلام رسول مہر کی 'غالب'، قاضی عبدالغفار کی 'آثار جمال الدین افغانی' اور 'آثار ابوالکلام آزاد' مولانا عبدالماجد دریابادی کی 'حکیم الامت'، 'نقوش وتاثرات'، صالحہ عابد حسین کی 'یادگارِ حالی' وغیرہ مشاہیر پر لکھی گئی اہم سوانح عمریاں ہیں۔ ان سوانح عمریوں کی خاص صفت یہ ہے کہ ان میں عقیدت کے رنگ کے باوجود تحقیق اور دیانتداری سے کام لیا گیا ہے۔ ان سوانح نگاروں نے اپنے لطیف پیرایۂ اظہار کے ذریعہ سوانح نگاری کے فن کو جلا بخشنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ ان سوانح عمریوں کو پڑھتے وقت قاری کو نہ صرف ان مشاہیر کی ذاتی زندگی کے حالات وکوائف سے آگہی حاصل ہوتی ہے بلکہ ان کے عہد کی تہذیبی وثقافتی فضا اور سیاسی وسماجی صورتِ حال سے متعلق بھرپور معلومات بھی حاصل ہو جاتی ہیں۔

اردو میں سوانح نگاری کی ابتدا مشاہیر کی سوانح عمریوں سے ہوئی لیکن جلد ہی خودنوشت سوانح عمریوں کی طرف بھی توجہ کی گئی۔ اردو میں پہلی خودنوشت سوانح مولانا جعفر تھانیسری نے 'تواریخ عجیب' کے نام سے لکھی۔ یہ خودنوشت ہے۔ اس میں مولانا جعفر تھانیسری نے کالے پانی کی سزا کے طور پر انڈمان میں گزارے ہوئے اپنے اوقات وحالات کو بہت پراثر انداز میں پیش کیا ہے۔ اس کے بعد لکھی جانے والی اہم خودنوشت سوانح عمریوں میں خواجہ حسن نظامی کی 'آپ بیتی'، ابوالکلام آزاد کی 'تذکرہ'، سر رضا علی کی 'اعمال نامہ'، ظفر حسن ایبک کی 'آپ بیتی'، مولانا حسین احمد مدنی کی 'نقشِ حیات'، شاد عظیم آبادی کی 'شاد کی کہانی شاد کی زبانی'، اعجاز حسین کی 'میری دنیا'، یوسف حسین خاں کی 'یادوں کی دنیا'، جوش ملیح آبادی کی 'یادوں کی برات'، کلیم الدین احمد کی 'اپنی تلاش میں' آلِ احمد سرور کی 'خواب باقی ہیں'، قدرت اللہ شہاب کی 'شہاب نامہ'، مشتاق احمد یوسفی کی 'زرگزشت'، خواجہ غلام السیّدین کی 'مجھے کہنا ہے کچھ اپنی زباں میں'، عبدالماجد دریابادی کی 'آپ بیتی'، اختر الایمان کی 'اس آباد خرابے میں'، مسعود حسین خاں کی 'ورودِ مسعود' اور سیّد محمد عقیل رضوی کی 'گئو دھول' وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ یہ خودنوشت سوانح عمریاں اردو کے ادبی سرمایے میں اہم اضافہ ہیں۔

سفرنامہ نگاری:

سفرنامہ ایک ایسی نثری صنف ہے جس میں ملک و بیرونِ ملک کے سفر کے مشاہدات، مناظر اور اہم معلومات کو ادبی پیرایے میں بیان کیا جاتا ہے۔ اردو میں سفرنامے کی روایت انیسویں صدی کے وسط سے ملتی ہے۔ سفرناموں کی تاریخ میں یوسف خاں کمبل پوش (حیدرآبادی) کے سفرنامے 'عجائباتِ فرنگ' کو اردو کا پہلا نثری سفرنامہ قرار دیا گیا ہے۔

یہ 1847 میں 'تاریخِ یوسفی' کے نام سے شائع ہوا تھا۔ اس میں کولکتہ سے انگلستان تک کے بحری سفر کی روداد بیان ہوئی ہے۔ اس سفرنامے کے اندازِ تحریر سے اس وقت کی اردو نثر کا اندازہ ہوتا ہے۔ محمد حسین آزاد کی 'سیاحتِ ایران' اور شبلی کے 'سفرنامۂ روم ومصر وشام' کو اس صنف کی ابتدائی شکل کہا جا سکتا ہے۔ دوسرے سفرنامہ لکھنے والوں میں محمد ہدایت اللہ مولوی مسیح الدین اور محمد عمر علی خاں کے نام قابلِ ذکر ہیں۔

بیسویں صدی کے ابتدائی سفرناموں میں ایک اہم سفرنامہ مولانا عبدالماجد دریابادی کا 'سفرِ حجاز' ہے۔ مذہبی اور علمی لحاظ سے اس سفرنامے کی بڑی اہمیت ہے۔ اس نوع کے دوسرے سفرناموں میں ممتاز مفتی کا 'لبیّک'، صالحہ عابد حسین کا 'دیارِ حبیبؐ'، احمد سعید ملیح آبادی کا 'بغداد سے مدینہ منوّرہ تک' ادبی لحاظ سے اہم ہیں۔

قاضی عبدالغفار کا 'نقشِ فرنگ'، بیگم حسرت موہانی کا 'سفرنامۂ عراق'، سید سلیمان ندوی کا 'سفرِ افغانستان'، خواجہ احمد عباس کا 'مسافر کی ڈائری'، آغا اشرف کے 'لندن سے آداب عرض' اور 'دیس سے باہر'، بیگم اختر ریاض الدین کے 'سات سمندر پار' اور 'دھنک پر قدم'، جمیل الدین عالی کے 'تماشا مرے آگے' اور 'دنیا مرے آگے'، ابنِ انشا 'دنیا گول ہے'، 'چلتے ہو تو چین کو چلیے' اور 'ابن بطوطہ کے تعاقب میں'، قرۃ العین حیدر کا 'جہانِ دیگر'، شفیق الرحمٰن کے 'دجلہ'، 'برساتی' اور 'ڈینیوب'، اشفاق احمد کے 'چنگو پاچیتاں'، 'عرشِ منور' اور 'سفر در سفر'، احتشام حسین کا 'ساحل اور سمندر'، وزیر آغا کا 'ایک طویل ملاقات'، رام لعل کے 'زرد پتوں کی بہار' اور 'خواب خواب سفر'، انتظار حسین کے 'زمیں دیکھ فلک دیکھ'، ممتاز مفتی کا 'ہند یاترا'، جوگندر پال کا 'پاکستان یاترا'، مستنصر حسین تارڑ کے 'اندلس میں اجنبی'، 'نکلے تیری تلاش میں' اور 'خانہ بدوش' وغیرہ بیسویں صدی کے دیگر اہم سفرنامے ہیں۔